

شاہ جی کی باتیں خوبصورت یادیں

میں تو کسی کا نقش قدم بن کر مٹ گیا مجھ سے نہ پوچھئے کہ گیا کارواں کہاں

امیر شریعت کو میری زندگی میں مرکزی روح (RULING SPIRIT) کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھے۔ وہ اس عہد کے سب سے بڑے مہربان رسول ﷺ تھے۔ انہوں نے جب رسول ﷺ میں ڈوب کر سنت صدیق اکبر ادا کی اور حضور ختم المرسلین ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ کرنے والے غاصبوں اور گروہ کٹھنوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اور اپنے جیسے مجاہدین احرار کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے۔ جس کا لوہنا پھونکا جب نبی ﷺ ہے۔ اور جو حضور ﷺ کی ختم نبوت کا ہر دو میں دفاع کرتی رہی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ شاہ جی نے جس دور میں کولہنی جدوجہد کا آغاز کیا وہ برہمچاری سے ایک مشکل دور تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت کا جبر و استبداد زوروں پر تھا۔ تو دوسری طرف پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کا گروہ احرار کی تحریک کے اسلئے حلف تھا۔ کہ اس نے غریب مسلمانوں میں جیسے کا حوصلہ۔ جب نبی ﷺ کا ولولہ اور غیر ملکی حکومت کو برصغیر سے نکال باہر کرنے کا بے مثال جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ شاہ جی اور احرار غریب اور متوسط مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ جنہوں نے قرآن اور حدیث کو لہنی جدوجہد کا رہنما بنا کر اس قدر طویل اور شاندار تاریخ حریت مرتب کی۔ کہ آج اور کل کا مورخ ان کا تذکرہ اور اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شاہ جی بڑی مہذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے معتد۔ مسلک ولی اللہی پر کاربند اور اکابر و ارباب العلوم و دیوبند کے ہم فکر تھے۔ اپنے عقائد میں بڑے راسخ اور مضبوط تھے۔ اور عقیدے کے معاملے میں فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے عقیدے میں تین چیزیں شامل ہیں۔

(۱) قرآن سے محبت (۲) ختم نبوت کا تحفظ (۳) انگریز سے نفرت۔

شاہ جی کو ایک بار ملنے اور دیکھنے کے بعد بڑے بڑے مخالفت بھی ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ برصغیر کی بعض ممتاز شخصیتیں اختلاف فکر و نظر کے باوجود ان کا احترام کرتی تھیں۔ اور ان سے باقاعدہ ملاقات کے لئے اہتمام کرتی تھیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اقبال کا شعر شاہ جی کی شخصیت پر کتنا صادق آتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اچھا جلا رہا ہے وہ مرد درویش دیے ہیں حق نے جس کو دیے ہیں انداز خسروانہ

شاہ جی کے توسط سے حضرت علامہ اقبالؒ علما نے دیوبند کے بہت قریب ہو گئے تھے اور بعد میں حضرت محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے تہر علی کے تو وہ بہت معتقد ہو گئے تھے۔ مشہور انگریز مورخ سر جان گنتھر جب ہندوستان کے دورے پر آیا۔ تو اس نے اسی عظیم مجاہد آزادی کو دیکھنا اور ملنا چاہا مگر شاہ جی ان دنوں راولپنڈی جیل میں تھے۔ اس نے اپنی کتاب "INSIDE INDIE" میں شاہ جی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے

لکھا ہے۔

”یہ شخص اگر انگلستان میں پیدا ہوتا، تو اس کی تصویریں گلیساؤں میں لگائی جاتیں۔“

۱۹۴۶ء میں شاہ جی دہلی میں مقیم تھے اور میر احمد حسین شملوی کے مکان پر قیام فرماتے۔ جواہر لال نہرو وہاں ملنے آئے اور ویر تک رسی خیر خیریت اور غیر رسمی سیاست کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر عزیز ادرھمن جاسی پہنچے کہ مہاتما گاندھی ملنا چاہتے ہیں۔ فلاں وقت اور فلاں دن۔۔۔۔۔ شاہ جی مقررہ دن مانگہ پر بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ انہیں ملنے گئے۔ بھنگی کالونی دہلی میں گاندھی جی کا قیام تھا۔ وہاں پہنچے تو باہر چارپائی پر خان بادشاہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے گلے لگایا، پھر شاہ جی گاندھی جی کو ملنے اندر چلے گئے۔ جہاں بقول شورش کاشمیری، سورۃ فاتحہ اور سورۃ اعلیٰ کے ترجمے اور تفسیر ہیں ہی وقت کٹ گیا۔ یہ دونوں سورتیں گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں پڑھتے تھے۔

اسی طرح امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔۔۔ شاہ جی کو دعوت دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ ندیہ کے میدان میں رات کو شاہ جی کا جلسہ تھا۔ جس میں انہوں نے وارث شاہ کے کچھ حسب حال پنجابی اشعار سنائے۔ دہلی والوں نے اسے گالی سمجھا۔ کسی نے امام الہند سے تذکرہ کیا کہ رات عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایسی تقریر میں گالیاں دی ہیں۔

اگلے روز شاہ جی مولانا کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ تو مولانا نے فرمایا ”شاہ صاحب سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لٹکا دیتے ہیں“

”حضرت! آپ سے کس نے کہا؟“

”کوئی بیان کر رہا تھا“

”کون؟“

”ہر کسی کا نام تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے“

”تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا“

”سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے۔ آپ سے جو تعلق خاطر ہے، اس کے باعث معاوہ چیز یاد آگئی۔“

”جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے“

”الحمد للہ وہ پانس اسیلے دماغ میں رہ گئی کہ آج سے چوبیس یا پچیس سال پہلے، آپ نے ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے جن میں جل، مل، قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگوا دی ہو“

شاہ جی مسکرائے اور کہا

”حضرت، ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو یاد ہے؟“

”میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں۔ گو حافظ ہر طرح کی شاہراہوں اور بگڈ ٹیڈیوں۔۔۔۔۔ گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وارث شاہ کا کلام تھا۔ آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا۔ اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا“

۔۔۔ سب سے بہت پہلے کی بات ہے۔ شاہ جی میانوالی جیل میں تھے۔ انگلستان کا ہوم ممبر ہندوستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے شاہ جی کو ملنے اور دیکھنے کے لئے میانوالی جیل کا دورہ کرکھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بہت

گھبرا دیا ہوا تھا۔ وہ بار بار شاہ جی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے التجائیں کرتا۔ کہ یہ دورہ کامیاب رہے اور رہنما کوئی ایسی بات نہ کریں۔ شاہ جی نے کہا۔ کہ لالہ جی آپ فکر نہ کریں۔ اس دورہ کے روز شاہ جی نے اپنے تمام ساتھیوں سے کہا۔ کہ وہ لیٹ جائیں۔ اور اپنے اوپر کھبل اوڑھ لیں۔ صرف اپنے اپنے پاؤں ننگے رکھیں۔ اور ان کا رخ دروازے کی طرف ہو۔ ایسا ہی ہوا صرف شاہ جی میرک کی سلاخوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہوم ممبر برہم رعونت و تمکنت کے ساتھ سیاسی قیدیوں کی میرک پر پہنچا تو ساوا شاہ جی سب نے اپنے پاؤں اس کی طرف کر کے اپنی حقارت و نفرت کا اظہار کیا۔ برطانوی نژاد ہوم ممبر شاہ جی سے مخاطب ہوا۔

شاہ صاحب: آپ اچھے ہیں؟

شاہ جی: خدا کا شکر ہے۔

ہوم ممبر: کوئی سوال؟

شاہ: میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔

ہوم ممبر: میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

شاہ جی: جی ہاں! آپ میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے!۔۔۔۔

شاہ جی:۔۔۔۔ علماء و اکابر دیوبند اور بزرگانِ رائے پور۔ گنگوہ۔ مکان شریف۔ سیال شریف۔ دین پور۔ آکو مہار شریف، گولڑہ شریف۔ علی پور سیدان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان مقامات پر اکثر حاضری بھی دیتے اور تقاریر بھی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ہماری معیت میں (۱۹۵۱ء) سیال شریف کے مدرسہ شمس الاسلام کے سالانہ جلسہ پر تشریف لے گئے تھے اور خواجہ قمر الدین سیالوی رحمہ اللہ کے مہمان تھے۔ انہوں نے شاہ جی کی بہت آؤ بگٹ کی۔ ہمارے ساتھ معروف احرار رہنما مولانا عبد الرحمن سیالوی بھی تھے۔ خواجہ صاحب اور ان کے مریدین نے مثالی مہمان نوازی، حسن سلوک اور بے پناہ احترام کا مظاہرہ کیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ سیال شریف والے اب یہ بات کیوں بھول گئے ہیں؟ کہ اتحادِ بین المسلمین کا اس دور میں سب سے بڑا داعی ان کے ہاں مہمان خصوصی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیوبند تشریف لے گئے۔ رات دارالعلوم میں تقریر کی اور سونے کے لئے مدنی منزل حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی کے ہاں تشریف لے گئے۔ فجر کی اذان ہو گئی تو ابھی وہ سو رہے تھے۔ حضرت مدنی متنبہ ہوئے اور ان کے پاس بیٹھ کر شاہ جی کے پاؤں دبانے لگ گئے۔ شاہ جی ہڑبڑا کر اٹھے اور حضرت مدنی کو پاؤں دبانے دیکھ کر اذہد پریشان ہوئے۔ کھنسنے لگے حضرت! آپ گھبرا کر رہے ہیں۔ حضرت مدنی نے فرمایا شاہ جی! نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا آپ کو جگا لوں۔ لیکن پھر خیال آیا آپ تھکے ہوئے ہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ پاؤں دابوں۔ تھکاوٹ دور ہوگی، آنکھ کھلے گی تو ممکن ہے نماز قضا نہ ہو!

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے نتیجے میں آپ لاہور جیل میں تھے۔ آپ کے ساتھ مشہور بریلوی عالم سید ابوالحسن قادری تھے۔ جو نام نہاد مسلکی اختلافات اور سیاسی راہوں کے جدا ہونے کی وجہ سے شاہ جی سے کبھی نہ ملے تھے۔ جب جیل میں شاہ جی کو دیکھا۔ ان کے عشق رسول ﷺ عقیدہ ختم نبوت کی پہنچی اور ایمان کی لازوال دینی و روحانی دولت کا مشاہدہ کیا تو شاہ جی کے گرویدہ ہو گئے۔ اور اس بات پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے۔ کہ عمر کا زیادہ

حصہ شاہ جی کی معیت کے بغیر کیوں گزارا؟

شاہ جی کی مغل میں تذکرہ ختم نبوت چمڑے ہی رنگ مغل تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور جوش سے لبریز اشعار کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ خصوصاً وہ اشعار جو آپ کے مزاج اور فکر کے آئینہ دار ہوتے وہ حاضرین کے قلوب پر بے حد اثر چمڑتے تھے۔ آپ کو نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی وجہ سے تمام مدعیان نبوت و رسالت سے آپ کو سنتِ خداوت تھی۔ حقیقت ایمان سے نا آشنا لوگ اس عقل کو مذہبی اور احرار رہنماؤں کی تنگ نظری قرار دیتے ہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ یہ تعصب یا حسد نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی انتہا ہے۔ جو شاہ جی کے دل و دماغ پر جلوہ گر ہوئی۔ لاؤ سپیکر تو آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ایجاد ہوئے تھے۔ مگر شاہ جی کی آواز کی بلندی کو اگر دیکھا جائے تو رسول کریم ﷺ کے زمانہ کے ہاشمی یاد آجاتے تھے۔ حضور ﷺ کے غم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی آواز کے متعلق علمائے تفسیر نے لکھا ہے۔ کہ آٹھ میل تک پہنچتی تھی۔ اسی طرح لاؤڈ سپیکر کے بغیر شاہ جی نے بڑے بڑے شہروں میں دو دو لاکھ کے کثیر مجمع سے خطاب فرمایا۔

یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ کہ تقریر اور خطاب میں شاہ جی کا کوئی ثانی کرشتہ ایک صدی کے دوران برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کو اپنی تقریر کے دوران اکثر نوقات سامعین، حاضرین کے عجیب اور مشکل ترین سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جن کا وہ اس خوبی اور تاثیرِ خطابت سے جواب دیتے تھے۔ کہ مجمع عیش و عشرت گشتا تھا۔ اگر ایسے سوالات کسی نور عالم یا خطیب سے کہے جاتے۔ تو وہ جواب کے لئے شاید مہینوں بتائیں لگاتے مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے برجستہ گوئی اور فی البدیہہ گفتگو کا جوہر خاص عطا فرمایا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے حصے میں کم ہی آسکا۔ ان کے تہر علمی کے سبھی معترف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بے شک بہت بڑے خطیب اور عالم تھے۔ مگر وہ شاہ جی کی طرح عوامی خطیب نہ تھے مولانا کے ہاں اختصار تھا اور شاہ جی کے ہاں ابلاغ۔

ایک جلسہ شاہ جی سے کسی نے سوال کیا۔ حضرت! سیدہ فاطمہ افضل ہیں یا جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری صاحبزادیاں افضل ہیں۔ جب کہ سیدہ رقیہ۔ سیدہ ام کلثوم۔ اور سیدہ زینب۔ آپ سے عمر میں بھی بڑی تھیں۔ فرمایا۔ فاطمہ افضل ہیں کیونکہ وہ نزول وحی کے بعد پیدا ہوئی تھیں اور دوسری نزول وحی سے پہلے! ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ خدیجہ میں کیا فرق ہے؟ ارشاد فرمایا بڑا فرق ہے۔ سیدہ خدیجہ کا نکاح محمد بن عبد اللہ سے ہوا تھا اور سیدہ عائشہ کا نکاح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔

کسی نے سوال کیا۔ حضرت آپ کو صاحبزادہ فیض الحسن نے کیوں چمڑوایا۔ ارشاد فرمایا وہ نور ہیں اور میں خاکی۔ ان نوریوں سے امید کب تک! سب سے بڑے نور ہیں جبریل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے شبِ معراج میں میرے نام کو سدرۃ المستقی پر ہی چمڑوایا تھا۔

آزادی سے چند ماہ بعد جب کہ پاکستان کے مسلمان احرار رہنماؤں کے سیاسی اختلافات کی بنا پر کچھ کچھ ہوئے تھے۔ شاہ جی پاکستان چوک ڈیرہ غازی خان کی سیرت کافر نس سے خطاب کرنے لگے تو اچانک نزدیکی مکان سے جلسہ گاہ میں پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ شاہ جی وظیفہ پڑھتے رہے۔ اور پتھر برستے رہے۔ جب یہ سلسلہ بند ہوا تو اس کوہ استقامت نے کہا۔

”تم پتھر برساتے رہے تو میں دل ہی دل میں خوش ہو کر کھڑا رہا اور اسی انتظار میں تھا۔ کہ کوئی پتھر آ کر

میرے دانت توڑ دیتا۔ تو میں اپنے نانا کی سنت کو تازہ کر دیتا۔ جو طائف اور اُحد میں ایس ہی صورت حال سے دو چار ہوئے تھے۔۔۔۔۔

یہ بات کچھ اسی انداز سے کی کہ ایک لٹ سارا مجمع زار و قطار رونے لگ گیا۔ اور جلسہ کے بعد بہت سے لوگوں نے آکر ان سے معافی طلب کی۔

آزادی سے قبل پشاور کے جلسہ عظم سے خطاب فرما رہے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو سکھ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مسلمان نعرہ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ مگر ہندو سکھ خاموش تھے۔ انہوں نے ہندوؤں سے پوچھا۔ مجھے بتاؤ "رام" کون ہے؟ انہوں نے کہا خدا۔ پھر سکھوں سے پوچھا۔ "واہ گورو" کس کو کہتے ہو۔ جواب ملا اللہ کہو! بلند آواز میں فرمایا۔ اگر رام اور واہ گورو اللہ ہے۔ تو پھر تم اللہ اکبر کیوں نہیں کہتے۔ اس پر سب نے نعرہ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔

شاہ جی کی شخصیت فقر و استغنا، صبر و قناعت۔ خودداری اور خود نگہداری کا دلدادہ مرقع تھی۔ چاہتے تو آج کل کے خطیبوں اور واعظوں کی طرح لاکھوں روپے کما سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ساری عمر ایسا نہ کیا۔ جو کچھ مل گیا وعظ کو اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ تو بنایا معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اسی میں گزارا کیا۔ اور آزادی کے بعد کا تمام عرصہ کرائے کے ایک معمولی مکان میں بسر کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے تھے۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ میانوالی سے رواجی کے وقت صوفی ائمہ و ائمہ حرم جو مجلس احرار کے نامور رشتہ کار تھے۔ اور شاہ جی کے انتہائی عقیدت مند، وہ شاہ جی، مولانا محمد علی، مولانا عبدالرحمن میانوالی اور سائیں حیات کے لئے سکینڈ کلاس کی ٹکٹیں لے آئے۔ شاہ جی نے ٹکٹیں دیکھیں اور مولانا محمد علی سے پوچھا۔ ان کا رنگ کچھ اور ہے۔ میں جو ٹکٹیں دیکھتا ہوں وہ زرد ہوتی ہیں اور یہ سبز معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ یہ اونپے درجے کی ہیں۔ فرمایا! مولوی صاحب! آگے کی فکر کرو ہاں اگر اچھا درجہ مل گیا۔ تو بات بن جائے گی۔ یہاں کے درجوں کو چھوڑو ٹکٹوں کو واپس کر کے وہی زرد ٹکٹیں لاؤ (تھرڈ کلاس) صوفی صاحب ٹکٹیں واپس کر آئے اور غالباً سات روپے کا فرق واپس ملا۔ شاہ نے وہ رقم مجھے مولوی محمد علی صاحب کو دے دی۔ کہ اس کی رسید کاٹ دو۔ وہ ساری عمر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے رہے۔ میں نے ایک بار سوال کیا۔ حضرت ایسا کیوں؟ اونپے درجہ میں سفر کرنے میں حرج کیا ہے۔ ارشاد فرمایا۔ تھرڈ کلاس میں گدڑی کے لعل مل جاتے ہیں۔ اور میرے وہاں بیٹھنے سے غریب مسلمانوں میں حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

میں ملتان میں ۱۹۶۰ء میں تھا۔ لائل پور (فیصل آباد) سے مولانا تاج محمود حرم وہاں کے ممتاز مل اور میاں محمد شفیع (کریسٹ ٹیکسٹائل ملز) کو لے کر آئے جو شاہ جی کے لائل پور میں قیام کے لئے ایک اچھی رہائش گاہ اور مکمل کفالت کی درخواست لے کر آئے تھے۔ ہو سکتا ہے میاں محمد شفیع اس میں اخلاص رکھتے ہوں۔ مگر جب شاہ جی سے مولانا محمد علی نے میاں محمد شفیع سے ملاقات کی درخواست کی۔ اور ساتھ اچھی پیشکش کا ذکر کیا۔ تو ارشاد فرمایا۔

"بھائی محمد علی! مجھے کسی مل (MILL) والے سے نہ ملاؤ۔ کسی دلی والے سے ملاؤ۔ یہ پیشکش سبھوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی اور معاشرتی ضرورت ہوگی۔ مجھے اب آخر عمر میں کیوں رسوا کرنے لگے ہو؟ میاں محمد شفیع شاہ جی سے ملے مگر دوران ملاقات اس بات کا قطعی ذکر نہ کیا!

۱۹۵۹ء میں ملتان کے کچھ دوستوں قاضی احسان احمد، اور مظہر نواز خان درانی نے شاہ جی کے عظیم آباد (پٹنہ) اور امرتسر کی رہائشی جائیداد کے عوض ملتان میں کلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ان دوستوں نے بحالیات کمشنر کی عدالت میں خود ہی کلیم داخل کر دیا۔ اور جب شاہ جی کا بیان لینے کے لئے انہیں عدالت میں لے جانے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں شاہ جی سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان دوستوں نے کسی طرح شاہ جی کو راضی کر لیا۔ جب شاہ جی عدالت میں پہنچے۔ تو وہاں انکی پدیرانی کی گئی۔ بیان کے دوران صرف اپنی دینی ادنیٰ کتابوں اور لائبریری کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اور بعد میں وہ اپنے مندرجہ بالا ساتھیوں سے کچھ عرصہ ناراض رہے کہ وہ انہیں دنیا کی طرف کیوں راغب کر رہے ہیں۔ مظہر نواز خان درانی کی ذاتی کوششوں سے کلیم منظور ہو گیا اور ایک مکان الاٹ کر دیا گیا۔ آج کل اس جگہ شاہ جی کے بیٹوں نے ایک دینی مدرسہ اور جامع مسجد تعمیر ہے۔ یہ جگہ دارِ نبی ہاشم کے نام سے معروف ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیرنی میں بوئے اسد اللہی (اقبال)
شاہ جی کی زندگی کا یہ استغنائی پہلو اس حدیث کا مفہوم یا تفسیر تھا۔ کہ جس میں فرمایا گیا
(بہترین آدمی فقیر ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے کنارہ کریں تو وہ بھی بے پروا رہے)

وہ صرف عبادت کے ڈسپلن اور پروگرام کے پابند رہتے تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی ان کے پروگرام میں تبدیلی نہ کر سکتا تھا۔ جماعت کے پروگرام کے علاوہ وہ اپنے احرار رضاکاروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور نہ ہی شفقت عطا فرماتے تھے۔ کہ ہر کوئی اپنی جان کا ہدیہ دینے تک کے لئے تیار رہتا تھا۔ وہ اپنے رضاکاروں کی درخواست جو اپنے شہروں میں انہیں لے جانے کے لئے کرتے تھے۔ کبھی رو نہ فرماتے تھے۔ فوراً اپنی جیبی ڈائری نکال کر تاریخ عطا فرمادیتے تھے۔

شاہ جی عالم و خطیب سیاست دان اور روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ شاعری بھی فرماتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ”سواطع الالہام“ کے نام سے ان کی زندگی میں انکے فرزند حضرت سید ابوذہر بخاری نے شائع کیا۔ شاہ عظیم آبادی کی صحبت کی وجہ سے وہ شعر و ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال سے بڑے اعلیٰ تمکانات تھے۔ اور جیسا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علامہ اپنا کلام شاہ جی کو سنا کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ افسوس اقبال کے نام نہاد مؤرخین نے محض تعصب اور تنگ نظری کے سبب اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ حضرت علامہ عقیدہ ختم نبوت کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اور انکی فکر کا یہ پہلو شاہ جی اور دیگر علمائے دیوبند کے ساتھ تمکانات کی وجہ سے مضبوط رہا۔

برصغیر کے ممتاز شعراء فیض، جگر، روش، نصرت قریشی،۔۔۔۔۔ تاثیر اور بعد کے دور میں۔۔۔۔۔ عدم۔۔۔۔۔ سہ۔ احمد ندیم قاسمی۔ حاضی کرمانی۔ عبدالکریم شر۔ طاہر شادانی۔ علامہ طاہر (مرحوم) اند ملتان۔ شاہ جی کے ہاں اکثر حاضری کرتے تھے۔ دیگر ممتاز شعراء علامہ انور عابری۔ عبدہ لطیف انور، آغا شورش کاشمیری۔ عبد الرحیم عاجز، طفیل امرتسری۔ تاجنہار مرزا، استاد و امین سائیں حیات تو ان کے شریک سفر تھے۔ الفرض شاہ جی کی شخصیت جامع بحالات تھی۔

یہ شاہ جی کی شخصیت کا جاذب نظر اور روحانی پہلو تھا۔ کہ مجلس احرار اسلام میں مختلف عقائد کے قومی رہنما اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور ان میں محبت اور اتحاد کا جو شاندار نظم و ضبط چشم فلک نے دیکھا وہ پھر کہیں نظر نہ آسکا شاہ جی اپنے تمام ساتھیوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان تمام رہنماؤں نے شاہ جی کے جذبہ جہاد اور عقیدت رسول ﷺ کے فیضان سے قربانیوں کی ایک لازوال تاریخ حریت ترتیب دی۔ ان رہنماؤں میں مولانا محمد داؤد غزنوی، چودھری افضل، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن مرحوم، مولانا عبد القیوم کانسوری مرحوم مولانا عبد القیوم پوپلزی مرحوم (پشاور) مولانا غلام غوث مرحوم شیخ حسام الدین مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی مرحوم۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔ قاضی احسان احمد مولانا گلشیر شید، حافظ علی بہادر، سید نوشیر علی، مولانا عبد الرحمن جاناہار مرزا، خواجہ عبد الرحیم عاجز، غازی محمد حسین (تانہ لیا نوالہ) عبد الرحیم جوہر، سردار محمد شفیع، چودھری عبد العزیز راہوں اور حافظ عبد الباقی ناپینا (فیصل آباد) شامل تھے۔ یہ تمام بزرگ اور رہنما شاہ جی کے جذبہ دروں اور نعرہ حق کی تصویر تھے۔

شاہ جی ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک برصغیر کی آزادی (۱۹۴۷ء تک) اور عقیدہ تحفظ ختم نبوت کے محاذوں پر مردانہ وار لڑتے رہے۔ ان کی یہ جدوجہد جو بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ نہایت کھٹن اور مشکل تھی۔ انہوں نے تحریک خلافت تحریک فوجی بھرتی، بائیکاٹ، تحریک کشمیر، تحریک تحفظ ختم نبوت اور دیگر کئی ملی اور قومی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جن کی پاداش میں وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ انگریزی دور میں ان پر سنگین سے سنگین مقدمات چلائے گئے۔ مگر وہ اپنے غیر سترزل ایمان، روحانی قوت، بزرگان ملت کی دعاؤں اور اپنی جماعت کے وفادار ساتھیوں کی قربانیوں سے ان مشکل مراحل سے باعزت سرخرو ہوتے رہے۔ لادھو سی کی ایک تقریر کی وجہ سے ان پر آزادی سے قبل دفعہ ۱۲۴ کے تحت مقدمہ چلا۔ اور حکومت پنجاب نے ان کو سزائے موت دلوانے کی سازش کی۔ تو ایک ہندو رپورٹر لدھارام کے بائیکوٹ میں اعتراضی بیان کی وجہ سے حکومت کو شرمندہ ہونا پڑا۔ لدھارام جو سرکاری رپورٹر تھا اس نے جسٹس ڈگلنگ سنگ کے سامنے کہا:

”میں اس رشی اور متی (روحانی شخصیت) کو دیکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ سچ یہ ہے کہ دی رپورٹ میں تحریف و رصانہ حکومت کے ایماء پر کیا گیا ہے۔

۱۲۴۔ الف کے اس مقدمہ سے شاہ جی باعزت بری ہوئے۔

چارہ گرنے مجھ کو باندھا تھا سمجھ کر ناتواں، ذرا تڑپا تو گھڑے ہی نہ تھے زنجیر کے (جگر)

شاہ جی کی زندگی کے بے شمار واقعات اور پہلو ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ چاہیے۔ ان کی داستانیں قریہ قریہ، بستی بستی، پرانے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ وہ جامع الصفات شخصیت تھے۔ اور ان جیسے لوگ روز پیدائش انہیں ہوتے۔ شاہ جی نے لوگوں کے اعتراض یا اعتراف کی پرواہ کئے بغیر تمام عمر اعلیٰ کھتہ الحق کا فریضہ انجام دیا۔ وہ علمائے حق کے محبوب تھے۔ حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری نے برصغیر کے ۵۰ نمائندہ علماء کے اجتماع میں انہیں امیر شریعت کا خطاب عطا فرما کر ان کے دست مبارک پر بیعت جہاد کی۔ شاہ جی حضرت شیخ العصر علامہ انور شاہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ”صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا۔ انور شاہ پیچھے رہ

گئے "اسی طرح شاہ جی کے متعلق حضرت اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ: "شاہ جی کی باتیں عطاء الہی ہوتی ہیں" حضرت شیخ الاسلام مولانا بشیر احمد عثمانی فرماتے تھے "شاہ جی اسلام کی مشین ہیں" مولانا حسین احمد مدنی علامہ انور شاہ کاشمیری۔ مولانا احمد سعید دہلوی۔ مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری۔ پیر طریقت عبدالقادر رائے پوری۔ حضرت گولڑوی۔ حضرت خواجہ ضیاء الدین۔ (سیال شریف) معنوی طور پر شاہ جی سے بہت محبت رکھتے تھے۔ آپ کی پہلی بیعت طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے تھی۔ ان کے انتقال کے بعد تجدید بیعت حضرت رائے پوری سے کی۔

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی کرم نوازی تھی کہ میرے لاشعوری دور میں، جب میں ڈبل کا طالب علم تھا، مجھے حضرت امیر شریعت کی نگہ لطف کرم عطا فرمادی۔ میرے سکول کے ایک سکھ استاد سردار خزان سنگھ اپنے درس میں حضرت امیر شریعت کا نام گرامی اکثر لیا کرتے تھے۔ مجھے "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کا نام۔ اس کا حسن۔ اس کی ترکیب بہت پسند آئی۔ اور میں غائبانہ طور پر اس شخصیت کا عقیدت مند ہو گیا۔ پھر حضرت مولانا بشیر احمد جو قافلہ احرار و جمعیت کے ممتاز رہنما تھے۔ کی قیادت و سیادت میں شاہ جی کا اکثر ذکر ہوتا۔ انجمن تبلیغ الاسلام۔ چونکہ ہر سال چونکہ میں دینی جلسہ منعقد کیا کرتی تھی۔ اس انجمن کی خدمات تبلیغ اسلام اور دین کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں بہت قابل قدر ہیں میں نے انجمن کے سالانہ جلسہ کا اشتہار پڑھا۔ اور اس میں شاہ جی کی تقریر کا اعلان پڑھا تو اپنے طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ پیدل چونکہ گیا۔ وہاں شاہ جی کو دیکھا اور سنا۔ لاشعوری دور کی بات ہے یاد نہیں کیا کیا سنا۔ مگر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس شخصیت کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد پسرور میں اجراء سٹوڈنٹس کا قیام شمل میں لے آیا۔ اور دور و نزدیک شاہ جی کی تقریر میں سے جلا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ۸-۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو میں فیروز پور احرار پراونشل کانفرنس پر چلا گیا۔ وہاں شاہ جی ایک ٹینٹ میں قیام پذیر تھے۔ میں نہایت عقیدت سے ملا۔ پاس صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ بیٹھے تھے۔ مجھ سے میرا پتہ پوچھا۔ میں نے پسرور کا ذکر کیا۔ تو گلے لگا لیا فرمانے لگے۔ یہ تو میرے استاد حضرت مولانا نور احمد پسروری ثم امرتسری کا شہر ہے۔ پھر مولانا روشن دین پسروری کی اپنے ساتھ رسالت میانوالی جیل ۱۹۲۱ء کا حوالہ دیا۔ مولانا بشیر احمد کے تعلق کی بات ہوئی۔ شاہ جی منراپا شفت بن گئے۔ اُس وقت سے لے کر ۱۹۶۲ء تک وہ میرے ساتھ عزیزانہ شفقت برتتے رہے۔ سیالکوٹ، لاہور، امرتسر، چونکہ اور دوسرے کئی مقامات پر انکی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ اور پھر میری عاجزانہ دعوت پر پسرور بھی آئے۔ ۲- روز قیام فرمایا ۳۶-۱۹۳۵ء کے انتخابات میں وہ اکثر مولانا مظہر علی اظہر (سیالکوٹ) پسرور / نارووال / قلعہ سوبا سنگھ کے حلقہ (صاحبزادہ فیض الحسن شاہ مرحوم (دہسائی علاقہ تحصیل دسکہ پسرور) اور جناب چوہدری محمد عبد اللہ خان (چونکہ ظفروال) کی انتخابی مہموں میں حصہ لینے شریف لاتے رہتے تھے۔ اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان کی تقاریر نوٹ کر کے "آزاد" لاہور میں رپورٹنگ کر دیتا تھا۔ تعلیم میرے لئے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اسی دوران انہوں نے قوم کا وہ شاندار تجزیہ پیش کیا۔ جو تمام برصغیر میں مشہور ہوا۔ چونکہ کے ایک اجتماع میں شاہ جی نے صاحبزادہ فیض الحسن سے پوچھا۔ شاہ صاحب! آپ کے حلقہ انتخاب کا کیا حال ہے؟ صاحبزادہ صاحب نے کہا۔ شاہ جی جیت رہا ہوں۔ انشاء اللہ تخت میری

ہے۔ شاہ جی ہنسے۔ صاحبزادہ صاحب سے کہا شاہ صاحب! میں اس قوم کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ تقریر میری سنتی ہے۔ بچہ نہ ہو تو کمویڈ آپ سے لیتی ہے۔ "تفسیر ابوالکلام کی پڑھتی ہے۔ حدیث حسین احمد مدنی سے سنتی ہے۔ فقہ اور فتویٰ کے لئے مفتی کفایت اللہ کے پاس جاتی ہے۔ علم احمد علی سے سیکھتی ہے مگر ووٹ کسی اور کو دیتی ہے۔"

بعد میں شاہ جی کا یہ تجزیہ صحیح ثابت ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب چوہدری مسرفراز سے شکست کھا گئے۔
میں نے ۱۹۳۸ء میں گزند میر بنک میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں شاہ جی لاہور آئے۔ پوچھا کیا کرتے ہو؟ عرض کیا "بنک میں ملازم ہوں۔" فرمایا "لگے بنک کیا ہوتا ہے۔۔۔ کچھ اثا سیدھا جواب دیا۔۔۔ پھر پوچھا یہ بنک کس کا ہے۔۔۔ میں نے کہا انگریزوں کا! اس پر خاموش رہے اور خاصا احسان احمد جو پاس بیٹھے تھے سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"احسان احمد! میری بد قسمتی ملاحظہ ہو۔ باپ ساری عمر انگریز کے خلاف لڑتا رہا۔ انگریز گیا۔ تو اولاد نے اس کی ملازمت کر لی۔"

میں نے اگلے روز جا کر استعفیٰ دے دیا۔ اور ملتان چلا گیا۔ سارا ماجرا بتایا فرمایا لگے میرا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا۔ پوچھنے لگے اب کیا ارادہ ہے میں نے کہا آپ کے پاس رہوں گا۔ مسلسل تین ماہ تک شاہ جی کے ساتھ رہا۔ سینکڑوں جلسوں کی رپورٹنگ کی۔ اور ان کی کسی بھی ملازم سے بڑھ کر خدمت کی۔ کنڈیاں سٹیشن پر مجھے گھر جانے کا حکم دیا۔ اور تین سو روپے کی خلیفہ رقم مجھے دی کہ میں اپنی اہلیہ کو جا کر ان کی طرف سے دے دوں! میں نے بت افکار کیا مگر نہ مانے فرمایا لگے۔

"تم نے میری بہت خدمت کی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اور تمہارے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا، تم کسی اپنے آپ کو اکیلے موس نہ کرنا میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا۔"

بعد کی ساری زندگی میں وہ ہمیشہ میرے لئے دعا گو رہے۔ میں ان کی خدمت میں مسلسل ملتان حاضری دیتا رہا۔ وہ اس عہد کے عظیم انسان، تاریخ ساز شخصیت اور سب سے بڑے عاشق رسول ﷺ تھے۔

حافظ جان محمد خادم شام غم

امیر	شریعت	عطاء	اللہ	شاہ
چوں	رخت	سفر	روح	برفک
بگفتند	خادم	ہم	چشم	تر
عزیز	و	اکار	عُفران	نک

۱۳۸۱ھ